R. No. 2166/57 Regd. No. L. 972.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 4/-
Per Copy -/12 P

جلد ۲۶ - شمارہ ۸ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ فروری ۱۹۶۷ء

اداریہ

مولانا آزاد کی یاد میں

مولانا آزاد کے انتقال کو نو برس ہو گئے۔ ہمارا ملک اپنے محسنوں کو بہت جلد بھلا دیتا ہے، مگر مولانا آزاد بھولنے کی چیز نہیں۔ ان کی یاد، ان کے کارناموں کا احساس، ان کی عظمت کا عرفان ہمارا قومی فریضہ ہے۔ ان سے آج بھی ہم بہت کچھ بصیرت حاصل کر سکتے ہیں، حال کے دھندلکے میں ان سے روشنی مل سکتی ہے، مستقبل کے لیے نیا عزم پیدا ہو سکتا ہے، ماضی صحیح پس منظر میں سامنے آ سکتا ہے۔

مولانا آزاد قدیم ماحول میں پلے بڑھے مگر اپنی انفرادیت کی وجہ سے حریت فکر پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ قدیم علوم پر ان کو پورا عبور تھا مگر انھوں نے جدید علوم سے بھی واقفیت حاصل کی اور وہ نظر پیدا کی کہ ارتقا کے قوانین، فطرت کے اسرار، سماجیات اور سیاسیات کے مسائل، ادب اور تہذیب کے رموز بھی ان پر منکشف ہو گئے۔ پھر ان کے علم نے انھیں عافیت کوشی اور خلوت گزینی کے بجائے زندگی کے دشت و صحرا میں سعی و عمل کے پھول کھلانے سکھائے۔ وہ بہت بڑے عالم دین تھے اور انھوں نے ترجمان القرآن لکھ کر قرآن کے حقیقی پیغام کو آج کی زبان میں پیش کیا، مگر انھوں نے اپنے ملک اور اپنے وطن کی خدمت کر کے یہ ثابت کیا کہ قوم کی آزادی اور اس آزادی کا استحکام، عالم و عامی سب کے لیے فرض ہے اور اہل علم کے لیے ہاتھی دانت کے مینار میں محصور ہونے کے بجائے زندگی کی کھلی فضا میں علم کو عام کرنا اور اسے عمل کی راہ ہموار کرنے کے لیے استعمال کرنا بہتر ہے۔

مولانا آزاد بڑے سچے مسلمان، بڑے اچھے اور پرجوش ہندستانی اور بڑے عظیم انسان تھے۔ مولانا کے اسلام نے انھیں وطن اور برادران وطن کے دکھ درد میں شرکت سکھائی۔ ان کی ہندوستانیت ان کے اسلام سے کبھی شرمائی نہیں۔ ان کے اسلام اور ان کے وطن کے تصور میں انسان دوستی اور عالمی اخوت اور دوستی برابر ابھارتی رہی۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے مولانا نے اپنی خطابت سے اردو زبان کی بے پناہ صلاحیتیں نمایاں کیں۔ انھوں نے اپنی تحریر سے اردو نثر میں جزالت اور شوکت پیدا کی۔ بلاشبہ انھوں نے عربی فارسی الفاظ ضرورت سے زیادہ استعمال کیے اور ان کی تقلید میں ہماری صحافت کی زبان خاصی بوجھل اور مصنوعی ہو گئی۔ مگر مولانا نے الہلال اور ترجمان القرآن کے ذریعے سے اردو میں علمی مسائل کے بیان کے اظہار کی اور زیادہ صلاحیت پیدا کی اور رفتہ رفتہ عربی فارسی الفاظ کی لے کم کر کے عام گروہ کے خطبے اور آخر کی تحریروں میں دکھا دیا کہ ان کے اسلوب کی عظمت عربی فارسی الفاظ کی مرہون منت نہیں تھی بلکہ اس میں ان کی فکری بلندی، علمی نظر اور انفرادی اظہار کی وجہ سے عظمت تھی۔ مولانا کے اسلوب کا ارتقا ادب کے طالب علموں کے لیے بڑی بصیرت رکھتا ہے۔

مولانا کا قاموسی علم، ان کی وضع داری اور نفاست، ان کا رکھ رکھاؤ اور بانکپن اور اس کے ساتھ ملک و قوم کی تاریخ کے ہر موڑ پر ان کا پیش پیش رہنا، ہر نئی تحریک اور ہر نئی لہر کے لیے ان کے دل میں گنجائش، مگر اس کے ساتھ اقدار اہم کے متعلق ایک واضح اور مرتب تصور، ہمارے لیے آج بھی معنی خیز ہے۔

ہندوستان کو ابھی مولانا آزاد کی زندگی اور کارنامے کی اہمیت کو اور سمجھنا ہے اور اردو دوستوں کا خصوصاً اور سچے قوم پرستوں کا عموماً یہ فرض ہے کہ وہ اس سمجھنے سمجھانے کے فرض کو برابر انجام دیتے رہیں۔ مولانا آزاد محض ایک سیاسی رہنما نہیں تھے۔ وہ ایک انجمن، ایک تحریک، ایک ادارہ، ایک میلان تھے۔ ان کی فکر اور ان کا طرز عمل دونوں مستقل اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت اور کارنامے کے مطالعے میں اردو دوستوں، مسلمانوں، ہندوستانیوں اور انسان دوستی کے علمبرداروں کے لیے آج بھی بہت کچھ گرمی اور روشنی ہے۔ ہاں اس گرمی اور روشنی سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے اندر بھی فکر و نظر کی جوت جگانی پڑے گی۔

ساہتیہ اکاڈمی کا انعام

نئی دلی۔ اس بار ساہتیہ اکاڈمی نے ملک کی گیارہ زبانوں میں بہترین کتابوں پر پانچ پانچ ہزار روپیہ کا انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

ساہتیہ اکاڈمی ہر سال ایسا انعام دیتی ہے۔ اس بار انگریزی اور

کشمیری، پنجابی اور تیلگو زبان کی کسی کتاب کو انعام کا مستحق نہیں سمجھا گیا۔

اس بار پہلی مرتبہ سندھی زبان میں شیخ راج عزیز کے شعری مجموعے "معراج جی گل" کو انعام ملا ہے۔ (قومی آواز)

پاکستان میں مرزا غالب کی صد سالہ برسی منانے کا پروگرام

لاہور۔ لاہور کے دانشوروں اور اہل قلم کے اجلاس میں اردو کے عظیم شاعر اور انشا پرداز مرزا اسد اللہ خاں غالب کی صد سالہ برسی منانے کے لیے پروگرام وضع کیا گیا۔ غالب کی زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کے بارے میں مختلف کتابیں شائع کرنے، ان کی غزلوں کا انگریزی ترجمہ چھاپنے اور ہفتہ جشن منانے کا فیصلہ کیا گیا۔

اس اجلاس کی صدارت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں نے کی۔ اس میں دیگر ادیبوں، دانشوروں اور اہل قلم کے علاوہ جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان، ڈاکٹر سید عبد اللہ، سید وقار عظیم، غلام رسول مہر، گروپ کیپٹن فیاض محمود، حامد علی خاں اور کیپٹن عبد الواحد نے شرکت کی۔ بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ مرزا غالب کے فارسی اور اردو کے تمام شعری و نثری مستند مطبوعات کا اہتمام کیا جائے۔

مرزا غالب کے متعلق اہل قلم اور دانشوروں کے تاثرات کو "غالب میری نظر میں" کے عنوان کے تحت ایک کتاب شائع کرنے، غالب کی زندگی اور ادبی کارناموں کے متعلق تنقیدی و تحقیقی مضامین پر مشتمل کتاب چھاپنے، غالب پر پچھلے سو سال کی تنقید کا ایک تفصیلی جائزہ کتابی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا علاوہ ازیں فیصلہ کیا گیا کہ غزل کے بادشاہ غالب کی زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کے متعلق انگریزی میں ایک [illegible]ب شائع کی جائے اور ان کی منتخب نظموں کا انگریزی میں تر[illegible]ئع کیا جائے۔ غالب پر اب تک جو کتابیں اور مضامین شائع ہو چکے ہیں ان کے ناموں پر مشتمل ایک کتاب چھاپی جائے گی۔

اس خاکے کے مطابق عمل کرنے کے لیے ارکان پر مشتمل ایک مجلس عاملہ قائم کی گئی جس کے صدر پروفیسر حمید احمد خاں، سکریٹری ڈاکٹر آفتاب احمد اور جائنٹ سکریٹری مسٹر سجاد باقر رضوی ہوں گے۔ مجلس عاملہ کے دوسرے ارکان ڈاکٹر سید عبد اللہ، ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور غلام رسول مہر ہوں گے۔ صد سالہ برسی کے موقع پر ہفتہ جشن غالب منانے کا فیصلہ کیا گیا جو مشاعروں، ڈراموں، سمپوزیم اور غالبیات کی نمائش پر مشتمل ہوگا۔ (دعوت دہلی)

حضرت نظیر اکبر آبادی کا عرس آگرہ میں منایا گیا

آگرہ۔ حضرت نظیر اکبر آبادی کا عرس پرسوں یہاں منایا گیا جس میں پانچ ہزار سے زائد افراد نے شرکت کی۔ اس تقریب میں شریک یو۔ پی کے سابق وزیر خزانہ مسٹر ایس۔ کے۔ ڈی پالیوال نے نظیر اکبر آبادی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ نظیر اکبر آبادی ایک متحدہ ہندوستان کا تصور رکھتے تھے مسٹر لوپن چند نے نظیر اکبر آبادی کی زندگی کی مثالیں پیش کیں اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا۔ عرس کی اس تقریب میں ہر طبقہ خیال اور مذہب و ملت کے ہزاروں افراد نے شرکت کی انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ (الجمعیۃ دہلی)

اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں

مندرجہ ذیل حضرات کو مختلف یونیورسٹیوں سے ان کے تحقیقی مقالے پر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں ملی ہیں۔ ان کے نام اور موضوعات درج ذیل ہیں:۔

ڈاکٹر نیر مسعود کو ملا محمد صوفی پر فارسی میں لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے۔ موصوف کو اس سے قبل الہ آباد یونیورسٹی سے مرزا رجب علی بیگ سرور، حیات اور کارنامے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے۔

جناب ملک زادہ منظور احمد کو ان کے تحقیقی مقالے "ابو الکلام آزاد کی ادبی خدمات" اور جناب انصار اللہ نظر کو ان کے مقالہ "میر علی اوسط رشک، حیات و خدمات" پر گورکھپور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی اسناد ملی ہیں۔

جناب خلیل احمد صدیقی کو ورکرم یونیورسٹی اجین نے ان کے تحقیقی مقالے "ریختی کا تنقیدی مطالعہ" پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی ہے۔

جناب جگن ناتھ آزاد کا تبادلہ

وزارت داخلہ میں نئے عہدہ پر تقرر

نئی دہلی۔ جناب جگن ناتھ آزاد کا پریس انفارمیشن بیورو سے حکومت ہند کی وزارت داخلہ میں پی۔ آر۔ او کے عہدہ پر تبادلہ ہو گیا ہے۔ پریس انفارمیشن بیورو میں وہ دس سال سے اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر تھے اور اس عرصے میں وہ ایک طویل مدت تک اردو پریس سے متعلق رہے۔

کسٹوڈین کے دفتر سے پہلی بار اردو نوٹس کا اجراء

[illegible] حامیان اردو کی مدد جہد سے محکمہ کسٹوڈین کے دفتر سے پہلی بار اردو میں نوٹس کا اجرا ہوا ہے۔ چنانچہ جناب سرداری لعل اسسٹنٹ کسٹوڈین درجہ اول نے رقم کی وصولی کے لیے ایک نوٹس جاری کیا ہے جو اردو میں ہے۔

سہ ماہی سیپ کراچی کا پہلا خاص نمبر

کراچی۔ حلقہ فکر و فن کا ترجمان اور اردو ادب کا ممتاز سہ ماہی جریدہ "سیپ" کراچی اپنے شمارہ نمبر ۹ خاص نمبر کی صورت میں پیش کر رہا ہے۔

سیپ کے اس خاص نمبر میں بھی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے پرانے اور نئے لکھنے والوں کی تحریریں شامل کی جا رہی ہیں۔

اس خاص نمبر میں برصغیر پاک و ہند کے تقریباً دو سو ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ "آج کا شاعر" "آج کا افسانہ نگار" اور مرحوم عظیم نفیسی پر خصوصی حصے شامل ہوں گے۔

یہ خاص نمبر مارچ ۱۹۶۸ء کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو رہا ہے۔

ابو سلمان شاہجہان پوری

قول فیصل

الہلال کا ایک مضمون "شہید اکبر نمبر ۱" اور اس کا مصنف

الہلال کے بعض مضامین کی ملکیت کے بارے میں پہلے بھی بحث چھڑ چکی ہے۔ اب پھر دار المصنفین کے ایک رفیق اور مولانا سید سلیمان ندوی کے معتقد خاص جناب ابو علی اعظمی صاحب نے پھر یہ بحث چھیڑی ہے پہلے میرا خیال تھا کہ اسے بڑھایا جائے اور اسی خیال سے ایک مراسلہ ہماری زبان کو بھیج چکا ہوں لیکن اب سوچتا ہوں کہ اس میں کوئی افادیت نہیں لہٰذا اسے بڑھانے کے لیے نہیں ختم کرنے کے لیے قلم اٹھایا ہے۔

میں یہاں الہلال کے ایک مشہور مضمون "شہید اکبر" کی ملکیت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کروں گا۔ اس مسئلے میں ابھی تک جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اور جس ماخذ سے استدلال کیا گیا ہے ان پر میری نظر ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جب کہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں میرے سامنے اخبارات و رسائل کی مجلدات اور کتب کا ایک ڈھیر ہے۔

"شہید اکبر" الہلال کے ایک سلسلہ مضمون کی سرخی ہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۳ء میں مسجد مچھلی بازار کانپور کے ایک حصہ کے انہدام اور پر امن نہتے مسلمانوں پر فائرنگ سے متعلق ہے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل تحریرات شائع ہوئیں:۔

۱۔ "شہید اکبر" کے عنوان سے ۶ر اگست کی اشاعت میں ایک شذرہ ہے جس میں محض واقعات کی روئداد ہے۔ اصل واقعہ پر تبصرہ یا اظہار خیال نہیں کیا گیا۔

۲۔ "شہید اکبر" اور "ہولناک و دردناک نظارہ کانپور میں" کے دوسرے عنوان سے ۱۳ر اگست کے الہلال میں مقالہ افتتاحیہ ہے۔ اس میں حادثہ کی تفصیل بھی ہے اور واقعہ محزنہ پر اظہار خیال بھی کیا گیا ہے یہ تحریر زبان اور انداز بیان کے اعتبار سے بلند اور اہم ہے۔

۳۔ ۲۰ر اگست کے شمارے میں اس مسئلے کے متعلق متعدد حضرات کے مراسلات و خطوط شائع ہوئے ہیں۔

۴۔ ۲۷ر اگست کے شمارے میں "شہادت زار کانپور یا امتحان گاہ کفر و ایمان جزاک اللہ عن الاسلام و المسلمین یا مظہر الحق" کے عنوان سے مقالہ افتتاحیہ ہے۔ اس میں مسٹر مظہر الحق بیرسٹر ایٹ لا بانکی پور کی تحسین فرمائی ہے۔ جو شہید کانپور کے مقدمات میں اسلام کی طرف سے گرفتاران بلا کی پیروی کر رہے تھے۔

۵۔ ۳ر ستمبر ۱۹۱۳ء کے اخبار میں "مشہد اکبر نمبر ۲" کے عنوان سے مقالہ افتتاحیہ ہے اس میں اسلامی تاریخ سے چھ حقائق کو چن کر ثابت کیا گیا ہے کہ کسی زمانے میں مسلمانوں کا خون قیمتی تھا، مگر اب اس سے زیادہ ارزاں کوئی چیز نہیں۔

اس صراحت کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے نقطۂ اختلاف کو متعین کر لیا جائے پھر اس بارے میں اظہار خیال کیا جائے۔ وہ اختلاف حسب ذیل ہے:۔

۱۔ سید سلیمان ندوی مرحوم نے صرف ایک مضمون کو اپنا بتایا ہے جو "شہید اکبر" کے عنوان سے بطور لیڈنگ آرٹیکل (مقالہ افتتاحیہ) شائع ہوا تھا۔ انھوں نے یا ان کے کسی معتقد نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ شہادت زار کانپور کے سلسلے میں تمام مضامین ابو الکلام کے نہیں سید صاحب کے ہیں۔

۲۔ مولانا آزاد کے معتقدین اور صاحبان علم و نظر بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سید صاحب کا ایک مضمون اس واقعہ محزنہ کی نسبت ہے۔

اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ شہادت زار کانپور کے سلسلے میں کون سا مضمون سید صاحب کا ہے؟ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا شہادت زار کانپور کے بارے میں الہلال کی پانچ اشاعتوں میں مضامین و مراسلات شائع ہوئے، ان میں ۲۰ر اگست ۱۹۱۳ء کے اخبار میں اس واقعے کی نسبت صرف مراسلات ہیں اس لئے اس کے بارے میں کوئی جھگڑا نہیں۔ سب سے پہلے اسے خارج از بحث کرتے ہیں۔ اس کے بعد ۲۷ر اگست ۱۹۱۳ء کے الہلال میں "شہادت زار کانپور یا امتحان گاہ کفر و ایمان جزاک اللہ عن الاسلام و المسلمین یا مظہر الحق" اس مضمون کے بارے میں بھی بحث نہیں، کیونکہ یہ مقالہ افتتاحیہ ضرور ہے لیکن اس کا عنوان "شہید اکبر" نہیں ہے۔ اس لیے سید صاحب کا دعویٰ ملکیت اس کی نسبت نہیں ہو سکتا۔ سید صاحب مرحوم کے کسی معتقد نے بھی اس کے نقش سلیمانی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، اس لیے ہم اس مضمون کو بھی بحث سے خارج کرتے ہیں۔

اب اس مسئلہ کی نسبت تین مضمون رہ جاتے ہیں جن کا عنوان "شہید اکبر" ہے انھیں میں سے ایک مضمون سید صاحب کا ہے۔ اب ان کے بارے میں غور کیجئے:۔

الف۔ پہلا مضمون "شہید اکبر" واقعہ محزنہ کانپور کی محض روئداد ہے اس میں نہ واقعہ پر تبصرہ ہے نہ بحث و اظہار خیال۔ "نیز" "شذرات" کے کالم میں شائع ہوا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ سید صاحب کا دعویٰ اس مضمون کی نسبت نہیں ان کے دعوے میں اس مضمون کی جانب اشارہ بھی نہیں پایا جاتا۔ سید صاحب کے کسی معتقد نے بھی اسے ملکیت سلیمانی قرار دینے کی کوشش

نہیں کی اس لیے اسے بھی خارج از بحث کیا جاتا ہے۔

(ب) اب دو مضمون رہ جاتے ہیں:

(اول) "شہید اکبر" اور "ندوہ کا دردناک نظارہ کانپور میں" مقالہ افتتاحیہ مورخہ ۱۳ر اگست ۱۹۱۳ء

(دوم) "شہید اکبر" مقالہ افتتاحیہ مورخہ ۲۳ر ستمبر ۱۹۱۳ء

ان دونوں مضمونوں ہی میں سے ایک سید سلیمان ندوی کا ہو سکتا ہے۔ سب سے پہلے ہم "شہید اکبر نمبر ۲" مطبوعہ ۲۳ر ستمبر ۱۹۱۳ء کی ابتدائی سطروں کی طرف توجہ دلاتے ہیں:

"کانپور کے آخری حوادث شروع ہوئے تو میں سفر میں تھا اور سفر بھی میرے لیے مانع کار نہیں ہو سکتا لیکن مشکل یہ تھی کہ ایک مقام پر قیام نہ ہونے کی وجہ سے سکون، جمعیت خاطر کہ جمع خیالات کے لیے ضروری ہے بالکلیہ میسر نہ تھے۔ جس زمانے میں کہ بندگان الٰہی کو جان اور زندگی بھی (جو ہر ذی روح کا قدرتی حق ہے) حاصل نہ ہو تو مجھے سکون و جمعیت کے حاصل نہ ہونے کی شکایت کا کیا حق ہے؟ اس لیے شاکی تو نہیں ہوں البتہ معذرت خواہ ہوں کہ اس واقعہ پر پوری تفصیل سے بحث نہ ہو سکی اور ایک مقالہ افتتاحیہ کے سوا جو صرف اصل حادثہ کے متعلق تھا اور کوئی تحریر اس اثناء میں نہ نکل سکی۔"

(صفحہ ۱۷۹)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس صاحب قلم کی یہ تحریر ہے اسے اس اثناء میں یعنی اگست میں جب کہ کانپور میں آخری حوادث شروع ہو گئے تھے سفر پیش آیا تھا اور یہ بات مختلف بیانات و شواہد کی روشنی میں ثابت ہو چکی ہے کہ یہ سفر سید سلیمان ندوی کو نہیں مولانا آزاد کو پیش آیا تھا۔ اس لیے یہ تحریر (شہید اکبر نمبر ۲) مولانا آزاد کی قرار پاتی ہے۔

مولانا آزاد کے معتقدین اور صاحبان علم و نظر نے اسے مولانا کی تحریر مانا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے بھی اسے اپنا مضمون نہیں بتایا بلکہ "شہید اکبر" نمبر اول کو اپنا بتایا ہے اور یہ شہید اکبر نمبر ۲ ہے۔ سید صاحب کے معتقد خاص ابو علی اعظمی صاحب نے بھی اسے مولانا آزاد ہی کی تحریر قرار دیا ہے اس لیے یہ مضمون سید صاحب مرحوم کی ملکیت سے خارج ہو جاتا ہے۔

(ج) اب صرف ایک مضمون "شہید اکبر" اور "ندوہ کا دردناک نظارہ کانپور میں" مطبوعہ ۱۳ر اگست ۱۹۱۳ء رہ جاتا ہے۔ آیا یہ تحریر سید صاحب کی ہے؟ سید مرحوم نے مضمون کی نسبت تین باتیں بیان فرمائی ہیں:

(اول) اس کا عنوان "شہید اکبر" تھا۔

(دوم) یہ مضمون بطور لیڈنگ آرٹیکل (مقالہ افتتاحیہ) شائع ہوا تھا۔

(سوم) مولانا ابوالکلام آزاد اس وقت سفر میں تھے اور ان کے قلم کی اصلاح کے بغیر شائع ہوا تھا۔

جہاں تک ان تینوں باتوں کا تعلق ہے بلاشبہ اس مضمون میں پائی جاتی ہیں۔ اس کا عنوان "شہید اکبر" ہے بطور لیڈنگ آرٹیکل (مقالہ افتتاحیہ) شائع ہوا ہے اور بلاشبہ اس وقت مولانا آزاد کلکتہ میں موجود نہیں تھے اس بنا پر میری رائے یہی ہے کہ یہ مضمون سید سلیمان ندوی کا ہے۔

"شہید اکبر نمبر ۲" (۲۳ر ستمبر) کا ایک اقتباس نقل کیا جا چکا ہے اس کی پہلی سطر یعنی "کانپور کے آخری حوادث شروع ہوئے تو میں سفر میں تھا" سے بعض دوستوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مولانا آزاد چونکہ سفر میں تھے اس لیے یہ تحریر انھیں کی ہے۔ یہ نتیجہ بالکل صحیح نکالا۔ ابو علی اعظمی صاحب نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا لیکن اس اقتباس کی آخری سطور "البتہ معذرت خواہ ضرور ہوں کہ اس واقعہ پر پوری تفصیل سے بحث نہ ہو سکی اور ایک مقالہ افتتاحیہ کے سوا جو اصل حادثے کے متعلق تھا اور کوئی تحریر اس اثناء میں نہ نکل سکی"۔ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اصل واقعہ کے متعلق افتتاحیہ بھی یہ سطریں لکھنے والے کے قلم سے تھا۔ ان الفاظ سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے لیکن زیر غور معاملے میں محض یہ استدلال اس معاملے کے قطعی فیصلے کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ ان الفاظ سے یہ استدلال کرنا مشکل ہے کہ اصل حادثہ کے متعلق مقالہ افتتاحیہ (یعنی شہید اکبر ۱۳ر اگست) بھی مولانا آزاد ہی کے قلم سے تھا۔

اسی طرح مولانا آزاد کے قیام لکھنؤ اور سفر کانپور کی ایک روداد (بحوالہ زمیندار، لاہور) کے مندرجہ ذیل الفاظ سے استدلال کیا ہے کہ پہلا مقالہ افتتاحیہ بھی مولانا آزاد کے قلم سے تھا:

"جب ایڈیٹر الہلال کانپور مسٹر ٹائلر (مجسٹریٹ کانپور) سے ملے تو انھوں نے (مجسٹریٹ نے) الہلال کے ان دونوں مضمونوں کا ذکر کیا (اور پوچھا) وہ مضمون آپ ہی نے لکھے تھے؟ میرے پاس وہ پرچے موجود ہیں اور میں ابھی ان کو نکالوں گا۔"

روداد سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ مولانا آزاد نے اس کا جواب اثبات میں دیا یا نفی میں میرا خیال ہے کہ اس سے بھی یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ "پہلا مقالہ افتتاحیہ مولانا آزاد کے قلم سے تھا۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ مولانا آزاد ٹائلر کو یہ جواب دیتے کہ ہاں! وہ مضامین میرے قلم سے ہیں جب ان کے جواب کا مطلب یہ لیا جاتا کہ وہ اس ذمہ داری کو بالالزام قبول کرتے ہیں جو اخبار کے شذرات یا لیڈنگ آرٹیکل کے متعلق ان پر عائد ہوتی ہے۔ مسٹر ٹائلر کے دریافت کرنے کا مطلب وہ نہیں تھا جو آج اس تحقیق سے ابو علی یا ابو سلمان کا ہے۔ (باقی صفحہ ۱۰ پر)

بسنت

کرشن موہن

جلوہ گر ہیں رہگذاروں میں بسنتی پیرہن — باعثِ کیفِ مشامِ جاں ہے خوشبوئے بدن
یہ ادائیں یہ اشارے یہ پھبن یہ بانکپن — گرم ہے دل میں بھی خواہشوں کی انجمن
کتنا من موہن بھی ہے رُتوں کا راجہ ہے بسنت — مست کر دیتا ہے تن من جس کا رنگیلا پن
شادمانی سکھ اور محبت پریم پیغامِ بہار — ان کے رنگ و بو فراواں جو دھرتی کو چمن

جاری و ساری رہے، تابندہ و زندہ رہے
کرشن موہن پریم کا بندھن، محبت کا چلن

رنجِ رائیگاں

رئیس مینائی

کبھی زخم بن کے کھلا ہوں میں
کبھی پھول بن کے کھلا ہوں میں
کبھی درد بن کے چمک گیا
کبھی ٹیس بن کے سسک گیا
کبھی چوٹ بن کے ابھر گیا
کبھی تنکا بن کے بکھر گیا
کبھی یاد بن کے ٹھہر گیا
کبھی گیسو بن کے سنور گیا
کبھی جام بن کے کھنک اٹھا
کبھی خوشبو بن کے مہک اٹھا
کبھی گیت بن کے ڈھلا ہوں میں
کبھی شمع بن کے جلا ہوں میں
کبھی نغمہ بن کے پلا ہوں میں
کبھی نالہ بن کے رہا ہوں میں
مجھے پھر بھی ایک خلش رہی، تری وسعتوں کو نہ پا سکا
مرا نغمہ تشنہ سہی، ترے دل میں کیوں نہ سما سکا

فنکار

مستحسن زیدی

منزلوں کے لیے میری عمرِ رواں
یوں ہی پھرتی رہی
روز و شب
کو بہ کو
حاصلِ زندگی!
جستجو جستجو
مشغلِ رہگذر
بن گئی زندگی ـــــ!

غزلیں

تارا چرن رستوگی طاہر

شیشۂ خود سے بھی پیار کس سبب سے ہے — دل و دماغ میں یہ آشنا طلب سے ہے
مرے سوال پہ کچھ اور روشنی ڈالو — یہ زیرِ لب جو تبسم ہے کس سبب سے ہے
سوال کیا تھا، ملا کیا جواب کیا معلوم — پر اشکِ دیدۂ بیدار کب سے ہے
عطا حیات ہوئی ہے کہ گلشنِ حسرت — یہی تو ایک گلہ مجھ کو اپنے رب سے ہے
ہے گوشے گوشے میں ایک خلفشار کا عالم — یہ حال آج کی دنیا کا کس سبب سے ہے
پہنچ گئی ہے کوئی آہ کیا شبستاں تک — دھواں دھواں سا افق پر رخِ جہاں کب سے ہے
خلوصِ دل کا نہیں کوئی قدرداں طاہر — زمانہ سازِ جنوں یہ خیال کب سے ہے

عبدالرحیم نشتر

جسم بھوکا ہے روح پیاسی ہے — کیا کہا بات یہ ذرا سی ہے
بے نیازی جواب ناز و خلوص — یہی طرزِ دلِ تمنا سی ہے؟
کتنے جلوے مری نگاہ میں ہیں — چشمِ حسرت کو اب کہیں کیا ہے
کٹ رہی ہے یہ بے صدا زمانہ — زندگی بھی تری اداسی ہے
دل تو اب بھی ہے اس کا دیوانہ — چشمِ جاناں ہی کچھ خفا سی ہے
ہے کوئی خاص بات اے نشتر — ان کے رخ پر جو کچھ حیا سی ہے

اختر نقوی

چشمِ حسرت کے سوا کیا ہے خریدار کے پاس — یوں تو بیدا سا نظر آتا ہے بازار کے پاس
کیا غمِ دہر کا بے کیف فسانہ کہیے — ابھی عنوان ہیں بہت گیسو و رخسار کے پاس
تہمتِ گل کی تمنا میں کوئی بیٹھا ہے — صحنِ گلشن سے الگ وادیٔ پُرخار کے پاس
دیدہ و دل ہیں کہ سمٹے ہوئے جاتے ہیں — کوئی سایہ دیکھیں یہ احسن طرحدار کے پاس
بڑھتے بڑھتے نہ پہنچ جائیں دریچوں کے قریب — چند سائے جو ہیں زنداں کی دیوار کے پاس
دو قدم سے نکل آیا تھا بھولے بھٹکے — سر پھرے ایسے ہیں چلتے ہیں دار کے پاس
دل کی آغوش میں معصوم تمنا کیا ہے؟ — اک گھروندا سا ہے اُجڑی ہوئی دیوار کے پاس

قطعات

علقمہ شبلی

شاہدِ وقت کے گیسو کی چمک ہے اردو
نغمہ سنجانِ گلستاں کی چہک ہے اردو
دہرِ تفریقِ وطن اس کو سمجھے ہے ورا لیا!
مادرِ ہند کے ہونٹوں کی مہک ہے اردو

نازشِ اہلِ حرم، فخرِ بتاں ہے اردو
اتحاد اور محبت کی زباں ہے اردو
آج لیکن یہ ہوا کیا کہ وطن میں اپنے
شدتِ کرب سے تصویرِ فغاں ہے اردو

صفحہ ۴ سے آگے

مجسٹریٹ کان پور کے سامنے مولانا ابوالکلام کے اثباتی جواب سے بھی استدلال مشکل ہوتا، یہاں تو اثبات یا نفی میں ان کا جواب ہی سامنے نہیں۔

ان دلائل کے علاوہ مختلف شواہد و نظائر سے میرے دوستوں نے ۱۴ر اگست ۱۹۱۳ء کے "مشہد اکبر" کو مولانا آزاد کی تحریر ثابت کیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ شواہد و نظائر قابل اعتنا نہیں۔ مولانا آزاد کے متعلق سید صاحب کے مغالطات کی فہرست بڑی ہی دردناک اور طویل سہی لیکن "مشہد اکبر نمبر اول" کو مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر ثابت کرنے کے لیے ان مغالطات سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہمارے دوست خالی الذہن ہو کر ۱۳ر اگست ۱۹۱۳ء کے "مشہد اکبر" کو منتقدی نظر سے دیکھیں خصوصاً ۳ر ستمبر کی تحریر "مشہد اکبر نمبر ۲" کو سامنے رکھ کر مطالعہ کریں تو انھیں ایک ہی نظر میں اندازہ ہو جائے گا کہ وہ تحریر مولانا آزاد کی ہو ہی نہیں سکتی بلکہ اس میں مولانا کا اسلوب اختیار کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔

اس مسئلے کی نسبت میں نے مولانا غلام رسول مہر صاحب سے ان کی رائے معلوم کی تھی مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے بالترتیب اپنے خیالات تحریر فرما دیے انھوں نے بعض اصولی اور اہم باتوں کی جانب توجہ دلائی ہے اور کچھ ضروری سوالات اٹھائے ہیں اس لیے نامناسب نہ ہوگا کہ یہاں مولانا کی رائے عالی درج کر دی جائے۔ مولانا مہر صاحب فرماتے ہیں:

۱۔ اگر ایک شخص کسی تحریک اداریے میں ملازم ہے تو کیا اسے حق پہنچتا ہے کہ نام کے بغیر شائع شدہ تحریروں میں سے جسے چاہے اپنی قرار دے دے؟

۲۔ الہلال کے متعلق ٹھیک یاد نہیں لیکن البلاغ میں بعض تحریریں مولانا سید سلیمان کے نام سے یا دوسرے اصحاب کے نام سے شائع ہوئیں حالانکہ ان میں سے بعض البلاغ میں ملازم تھے۔ مثلاً مولانا مظہر الدین شیرکوٹی مرحوم، گویا مولانا نے خود ادارتی تحریرات اور ذاتی تحریرات میں امتیاز قائم رکھا۔

۳۔ سید سلیمان مرحوم یا ان کے نیازمند ایک بھی مجموعہ تحریرات ایسا پیش نہیں کر سکتے جس کے متعلق دعویٰ کیا جا سکے کہ وہ مولانا نے مرتب کرایا یا چھپوایا ہو پھر ان پر الزام تراشی کے لیے کون سی بنیاد ہے؟ الزام ان لوگوں پر عائد ہونا چاہیے جنھوں نے الہلال اور البلاغ سے وہ تحریریں نقل کیں اور ہر اس تحریر کو مولانا کے رشحات قلم کا نتیجہ قرار دے لیا جس پر کسی کا نام درج نہ تھا۔

۴۔ اگر یہ درست ہے کہ مولانا نے سید سلیمان مرحوم کو "مشہد اکبر نمبر ا" پر کوئی عتاب آمیز خط لکھا جیسا کہ خود سید صاحب کے ایک قول سے ظاہر ہے (جو مولانا ابوالخیر مودودی نے مولانا عبداللہ عمادی کے حالات میں نقل کیا ہے) تو میرے نزدیک بالکل ٹھیک کیا، اس لیے کہ "مشہد اکبر نمبر ا" اخبار نویسانہ ذمہ داری کے نقطۂ نگاہ سے سخت قابل اعتراض ہے اور محرر کے فکر و نظر کی ناپختگی اور اس سلسلے میں قانونی حدود سے بے خبری کی ایک افسوسناک دستاویز ہے خواہ جذباتی اعتبار سے اس کا درجہ کچھ ہو۔ مولانا کی تحریروں میں اس سے زیادہ سخت مقالے موجود ہیں مگر ان پر قانونی گرفت نہیں ہو سکتی۔

۵۔ سید سلیمان مرحوم کی فرد مایگی حوصلہ کا یہ ایک عجیب پہلو ہے کہ اس ایک مضمون کے لیے انھوں نے پاک و ہند کی فضا میں ہر جگہ غوغا بپا کرنے کی کوشش کی ہم لوگوں کا درجہ تحریر میں بہت پست ہے تاہم سیکڑوں مقالے لکھے جن پر فخر کر سکتے تھے مگر کبھی ان کا خیال بھی نہ آیا۔

۶۔ مولانا ابوالخیر مودودی نے ایک مضمون "مولانا عبداللہ عمادی مرحوم" پر "نقوش" کے شخصیات نمبر ۲ میں چھپایا تھا اس میں وہ لکھتے ہیں کہ سید سلیمان مرحوم حیدرآباد آئے تھے اور دارالمصنفین کی کسی کتاب کے سلسلے میں مولانا عمادی سے بھی ملے تھے۔ جاتے ہی مولانا آزاد کے خلاف گفتگو شروع کر دی (اور مولانا ابوالخیر کے قول کے مطابق یہ لوازم گفتگو میں سے تھا) کہ مولانا آپ کو وہ کانپور کی مسجد والا مضمون اور ابوالکلام کا برہمی کا خط یاد ہوگا۔ اسی مضمون سے شہرت لی اور اسی مضمون پر لکھنے والے کو غیظ و غضب سے نوازا۔ اور مولانا آپ نے دیکھا کہ آپ کے وہ مضامین بھی ملفوظات ارتقی میں شامل کر لیے جو آپ وہاں چھوڑ آئے تھے .... عمادی صاحب نے کہا۔

"چھوڑیے جناب مولانا ان باتوں کو۔ اب وہ مضامین نہ مولانا ابوالکلام کے لیے کوئی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ آپ ہی کے لیے۔ یاد کے قابل تو وہ صحبتیں ہیں جو مولانا ابوالکلام کے ساتھ گزر گئیں۔ پھر وہ لطف صحبت حاصل نہ ہوا۔"

مولانا ابوالخیر لکھتے ہیں:

"سید سلیمان کو یہ بات خوش نہ آئی۔ بڑی دل گرفتگی سے عمادی صاحب کی کدورت تکنے لگے۔ میرے لیے

یہ سب بہت دلچسپ معاملہ تھا۔"

۷۔ سید سلیمان مرحوم کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ مولانا آزاد کی شہرت کا مدار مشہد اکبر نمبر ا ہے۔ اس سے پیشتر ان کے بیسیوں مضامین لوگوں کو اس طرح یاد تھے جس طرح غزلوں کے اشعار یاد ہوتے ہیں اور وہ چوبیس سال کی عمر میں شہرت کے اس اوج و عروج پر پہنچ چکے تھے جو بے شمار لیڈروں کو زندگی کے آخری مراحل میں بھی حاصل نہ ہو سکا۔ یہ سید صاحب کی اپنی تحریرات کے بھی خلاف ہے۔

۸۔ خوش ذوق ارباب علم کی بات وہ ہے جو مولانا عمادی نے کہی۔ گویا انسانوں کی زندگی چند مضامین و مقالات پر نہیں۔

۹۔ خود مجھے یاد ہے (یہ غالباً اس زمانے کی بات ہے جب مولانا سید سلیمان مرحوم پاکستان آ گئے تھے) کہ میں دہلی میں مولانا کے پاس بیٹھا تھا اچانک پشاور کے ایک صاحب آئے اور کہا کہ سید سلیمان شاکی ہیں ان کے مضامین آپ نے اپنے نام سے چھپوائے مولانا نے فرمایا بھائی میں نے تو آج تک اپنا بھی کوئی مضمون نہیں چھاپا آپ مولانا سلیمان سے کہہ دیں کہ الہلال و البلاغ میں جتنے مضامین آپ کے ہیں وہ لے لیں اور جو باقی بچیں وہ میرے لیے چھوڑ دیں۔"

۱۰۔ میری رائے پہلے دن سے یہی ہے کہ مشہد اکبر نمبر ا سید سلیمان کا ہے اور مولانا سے اس کا انتساب نہ کیا جائے۔ اگر اور کوئی مضمون ایسا ہو جس کے لیے سید مرحوم یا ان کے معتقدین نے دعویٰ کیا ہو تو معلوم ہونا چاہیے وہ کونسا ہے؟ ادارہ تحریر کے کسی رکن کا مضمون ایڈیٹر ضروری ترمیمات کے بعد نام کے بغیر چھاپتا ہے تو اس کا مدعی وہ رکن نہیں ہو سکتا۔"

مولانا مہر صاحب نے سید صاحب کی جس ذہنیت اور جن اصولی باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے اس پر کسی تبصرے کے متذکرہ نکات میں ۲ میں مذکور نقطے سے متعلق سہ روزہ اخبار کی ضرورت نہیں البتہ دفعہ ۲ کے بارے میں یہ وضاحت نامناسب نہ ہو گی کہ سہ روزہ اخبار "مدینہ" بجنور ۹ دسمبر تا ۲۱ر نومبر ۱۹۶۰ء کی اشاعتوں میں مولانا عبد الباری حضری نے اپنے مضمون "مضامین الہلال اور سید صاحب کا دعویٰ ملکیت" کی ۹ دسمبر کی مطبوعہ قسط میں بالتفصیل بتایا ہے کہ سید صاحب کے تمام علمی و تحقیقی مضامین و مقالات جن کا تعلق ادارتی تحریرات سے نہیں تھا۔ ان کے اپنے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ اس وقت بھی جب کہ وہ الہلال کے عملۂ ادارت میں ملازم تھے اور اس کے بعد بھی۔ الہلال کے عملۂ ادارت کے دوسرے ارکان کی ذاتی تحریرات بھی ان سب کے ناموں کی تصریح کے ساتھ شائع ہوتی ہیں۔

مجھے امید ہے کہ مولانا ابو الکلام آزاد کے معتقدین بھی اس رائے سے اتفاق کریں گے نیز یہ سطریں سید سلیمان ندوی کے معتقدین کی بے چینیوں کا مداوا اور ان کے زخموں کے لیے مرہم ثابت ہوں گی اور مشہد اکبر نمبر ا کی حد تک آئندہ یہ بحث چھیڑنے کی انھیں ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

مراسلات

طاہرہ دیوی شیرازی؟

ہماری زبان شمارہ ۱۵ رجنوری ۱۹۹۷ء میں جناب عبدالودود کا ایک مراسلہ طاہرہ دیوی شیرازی کے بارے میں شائع ہوا ہے۔ انھوں نے ان کی حقیقی حیثیت کے بارے میں دریافت کیا ہے کہ وہ واقعی کوئی خاتون تھیں یا اس فرضی نام سے نیاز صاحب خود لکھا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں کوئی مستند ثبوت تو پیش نہیں کر سکتا لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ وہ واقعی ایک فرضی نام تھا۔ جن دنوں ان کے افسانے ساقی میں (آزادی سے قبل) شائع ہوتے تھے لاہور کے ادیبوں میں اس نام کے چرچے اکثر سنے تھے تبھی سے میرے ذہن میں یہ بات موجود ہے کہ ان کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔ رومانی اور حیرت ناک افسانے لکھنے کے شدید جذبے (OBSESSION) کو تسکین کرنے کے لیے ہی نیاز صاحب ایسا کرتے رہے ہوں گے۔ ۱۹۴۰ء کے عہد میں ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے نیاز صاحب اپنے نام کے ساتھ اس قسم کے افسانے پیش نہ کرنا چاہتے ہوں۔ لیکن انھوں نے اپنی جوانی کے عالم میں اس قسم کے افسانے یقیناً لکھے تھے۔ فرضی نام اختیار کرنے کا ایک واقعہ زمانی بیگم کا بھی مشہور ہے جس پر ہماری زبان کے صفحات پر بھی کئی بار بحث ہو چکی ہے کسی مرد کا کسی عورت کا نام اختیار کر کے افسانے یا نظمیں پیش کرنا دراصل ایک قسم کی جنسی لذت ہی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس حرکت کے مرتکب اردو کے کچھ دوسرے فنکار بھی ہوئے ہیں جن کا ذکر یہاں مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

طاہرہ دیوی شیرازی کے سلسلے میں ایک اور دلچسپ واقعہ بھی ہوا تھا جسے بیان کر دینا شاید قارئین ہماری زبان کے لیے باعث دلچسپی ہو۔

آزادی سے قبل لاہور سے قمر جلال آبادی کی ادارت میں ایک ہفتہ وار اخبار خلشار نکلتا تھا۔ ۱۹۴۲ء کے آس پاس اس میں ایک نئے افسانہ نگار رتن رسالپوری کا ایک افسانہ شایع ہوا تھا جو ساقی دہلی میں کچھ ہی عرصے کے بعد طاہرہ دیوی شیرازی کے نام سے شایع ہو گیا۔ میں نے ساقی کی ایک کاپی رتن رسالپوری کو بھجوائی تھی جو ان دنوں میرن شاہ (صوبہ سرحد) میں رہتے تھے (آج کل وہ بٹالہ میں فوٹوگرافی کے بزنس میں ہیں) افسانے کا مختصر پلاٹ اس طرح سے تھا۔ ایک نوجوان ڈاک خانے میں کام کرنے والی ایک لڑکی پہ عاشق ہو گیا وہ اس سے ملنے کے لیے کسی نہ کسی بہانے سے ہر روز ڈاک خانے چلا جاتا۔ کبھی پوسٹ کارڈ خریدنے کبھی منی آرڈر فارم لینے کے لیے۔ جب لڑکی اس سے متاثر نہ ہوئی تو ایک روز اس نوجوان نے اس سے تار کا فارم لے کر اپنے کسی دوست کو اس مضمون کا تار دیا۔ میں یہاں کے ڈاک خانے کی کاؤنٹر گرل کی محبت میں مبتلا ہو گیا ہوں لیکن وہ میری ذرا پروا نہیں کرتا مشورہ دو کہ میں کیا کروں؟

اس نے تار کا فارم لڑکی کے ہاتھ میں دے دیا۔ لڑکی نے تار پڑھا اس کے الفاظ گنے اور پھر پوری سنجیدگی سے بولی۔ ایک روپیہ چار آنے!

طاہرہ دیوی شیرازی یا اس نام کے حقیقی محرک نے ایسا کیوں کیا اس کی وجہ انھیں کو معلوم ہوگی لیکن مجھے معلوم ہے کہ میرے دوست رتن رسالپوری کو اس بات سے بڑا صدمہ پہونچا کہ ان کا ایک مطبوعہ افسانہ ایک مشہور ادیب نے اپنے نام سے شایع کرا لیا۔ ساقی کے پرانے پرچوں کو دیکھئے یہ افسانہ ضرور مل جائے گا جس کا عنوان مجھے یاد نہیں رہا ہے۔

لکھنؤ میں نیاز صاحب سے میں نے کئی بار ملاقات کی تھی لیکن ان سے طاہرہ دیوی کے بارے میں کچھ پوچھنے کی میں کبھی ہمت نہ کر سکا۔

(رام لعل)

طاہرہ دیوی شیرازی؟

محترمی عبدالودود صاحب کا مراسلہ ۱۵ رجنوری ۱۹۹۷ء کے ہماری زبان "علی گڑھ میں نظر سے گذرا۔ جس میں "طاہرہ دیوی شیرازی" کی شخصیت کے بارے میں استفسار کیا گیا ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ حال ہی میں اردو ڈائجسٹ لاہور کے سالنامہ ۱۹۹۷ء میں فضل حق قریشی صاحب کا ایک مضمون بعنوان "پردہ اٹھتا ہے" شایع ہوا ہے۔ اس مضمون میں اس پراسرار مصنفہ کے حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اصل میں یہ تمام واقعہ فضل حق صاحب قریشی کی اپنی ذہنی پیداوار تھا۔ طاہرہ دیوی شیرازی کے پس پردہ خود ان کی ذات تھی۔ اس فرضی نام سے انھوں نے کئی افسانے لکھے تھے۔ جن میں سے اکثر ساقی دہلی اور نگار لکھنؤ میں شائع ہوئے تھے۔ نیاز صاحب اس مصنفہ کے بڑے مداح تھے۔ ان کی طرز تحریر سے متاثر تھے کہ بنگال سے اتنی اچھی اردو لکھنے والی کونسی ہستی ہے اس سلسلہ میں نیاز صاحب ایک مرتبہ کلکتہ بھی گئے تھے۔ لیکن جس پتا کے ہوئے پتہ پر خط و کتابت ہوتی تھی وہاں پر ان کی ملاقات مصنفہ سے نہیں ہو سکی۔ بلکہ ان کو ٹال دیا گیا کہ مصنفہ ہسپتال میں بیمار ہیں ملاقات نہیں ہو سکتی۔ بعد میں فضل حق قریشی صاحب جب لکھنؤ میں نیاز صاحب سے ملے تو انھوں نے طاہرہ دیوی سے ملاقات نہ ہونے پر افسوس ظاہر کیا۔ اس سلسلہ میں نیاز صاحب نے ان کو اپنا اور قمر زمانی بیگم والا واقعہ بھی سنایا تھا کہ انھوں نے کس طرح شاہ دلگیر مرحوم کو اس فرضی نام سے خطوط لکھ کر بیوقوف بنائے رکھا تھا۔ شاہد احمد صاحب

کو بھی شبہ تھا۔ کہ آیا یہ طرزِ تحریر نیاز صاحب کا ہے یا فضل حق قریشی کا۔ مگر فضل حق صاحب قریشی کے اطمینان دلانے پر وہ مطمئن ہوگئے تھے۔ شاہد صاحب کو اس سلسلہ میں رازدار اس وقت بنایا گیا تھا۔ جب ساقی بکڈپو دہلی سے افسانوں کا مجموعہ "سحر بنگال" شائع ہوا۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم کو اس سلسلہ میں کافی شبہ تھا چنانچہ انھوں نے ادب لطیف میں ایک مضمون کے ذریعہ اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ کہ اس نام کے پس پردہ نیاز صاحب افسانے لکھ رہے ہیں۔ جو کہ مصنفہ کے بڑے مداح ہیں۔ مصنفہ کے خطوط بھی انھیں نے شاہد صاحب سے طلب کیے۔ تاکہ اصلیت کا پتہ چلایا جاسکے۔ مگر مصنفہ کی طرف سے خط آنے پر وہ مطمئن ہوگئے تھے۔ آخر میں فضل حق قریشی صاحب ایک واقعہ سے اس قدر دل برداشتہ ہوئے تھے۔ کہ آئندہ انھوں نے اس فرضی نام سے کوئی افسانہ نہیں لکھا۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب اس مصنفہ پر اس قدر فریفتہ ہوگئے تھے۔ کہ انھوں نے اس سے شادی کرنے کی خاطر اپنی بیوی کو طلاق دینا منظور کر لیا تھا۔ لیکن ان کی بیگم نے ایک خط مصنفہ کے دئے ہوئے پتہ پر لکھا۔ تو اصل مصنفہ یعنی فضل حق قریشی صاحب اس واقعہ سے اس قدر افسردہ ہوئے کہ انھوں نے نصیر الدین ہاشمی صاحب کو مصنفہ کے نام سے خط لکھ کر آئندہ خط وکتابت بند کردی۔ بقول ان کے طاہرہ دیوی شیرازی کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "بوجھو تو جانیں" ساقی بکڈپو دہلی سے شائع ہونے والا تھا۔ مگر فسادات کی وجہ سے تمام اثاثہ تلف ہوگیا۔ مصنف اس سلسلہ میں موصول شدہ خطوط جو کہ مختلف ادیبوں نے لکھے ہیں۔ اردو ڈائجسٹ کے آئندہ شمارہ میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جس سے اس پراسرار مصنفہ کے مزید پوشیدہ گوشے منظر عام پر آسکیں گے مضمون کافی طویل ہے۔ اور دلچسپ بھی کئی اور اصحاب کی نظر سے بھی گذرا ہوگا۔ یہ تھی طاہرہ دیوی شیرازی کی اصل حقیقت اس نام کے پردہ میں فضل حق قریشی صاحب تھے جنھوں نے ایک طویل عرصہ کے بعد اس واقعہ پر روشنی ڈالی ہے۔ خدا کے فضل سے فضل حق قریشی صاحب اور شاہد احمد دہلوی صاحب ابھی بقید حیات ہیں وہ اس واقعہ پر تفصیل سے روشنی ڈال سکتے ہیں۔

(عبدالقیوم خان درانی گجرات (مغربی پاکستان))

امانت کی اندر سبھا کے بارے میں

کوکب صاحب کا مراسلہ "ہماری زبان" مورخہ یکم فروری ۱۹۷۰ء نظر سے گذرا۔ میں نے اپنے سابقہ مراسلہ میں یہ عرض کیا تھا کہ پرتگالیوں، ڈچ، انگریزوں اور فرانسیسیوں میں سے کسی نے بھی لکھنؤ تو کیا پورے اودھ میں کوئی تھیئٹر تعمیر نہیں کیا"

اس کا سیدھا سادھا جواب یہ تھا۔" فلاں کتاب مصنفہ فلاں کا صفحہ فلاں یا سفرنامہ فلاں کا صفحہ فلاں ملاحظہ ہو اور اصل عبارت کے چند متعلقہ اقتباسات دے دئے جاتے کہ پڑھنے والوں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی لیکن اصل موضوع کی طرف توجہ دینے کی بجائے کوکب صاحب نے غیر متعلق اقتباسات سے اپنے مراسلہ کو وزنی بنانے کی کوشش کی۔

کوکب صاحب نے ایما رابرٹس کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "نامی صاحب اگر انگریز سیاح ایما رابرٹس کا سفرنامہ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ۱۸۳۰ء سے پہلے کانپور میں تھیئٹر قائم ہو چکے تھے اور بڑی خوش اسلوبی سے اپنا کام کر رہے تھے"

مناسب ہوتا کہ کوکب صاحب ایما کی اصل عبارت بھی نقل کر دیتے کہ تشنگان اردو تھیئٹر کو ایما کا نظریہ معلوم ہو جاتا۔

اب میں کوکب صاحب کی توجہ HAKLUYT سوسائٹی کے سفرناموں کی طرف مبذول کراؤں گا۔ اس سوسائٹی نے سولہویں، سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے بہترین سفرنامے شائع کئے ہیں۔ میں نے ان کے مطالعہ کے بعد جو یادداشتیں تیار کی ہیں ان کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ کسی شخص نے بھی کانپور میں کسی تھیئٹر کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوکب صاحب کو غلط فہمی ہوگئی ہو اور انھوں نے ناٹک کی کسی صورت FORM کو ڈراما اور ناٹک شالہ کو تھیئٹر سمجھ لیا ہو۔

میں کوکب صاحب کی معلومات کے لیے عرض کروں گا کہ گورنمنٹ آف مہاراشٹر کے آرکائیوز میں جو اپنی نوعیت کا آپ ہی نظیر ہے انگریزوں کے ابتدائی تجارتی مرکز جو ۱۶۶۸ء تک سورت میں تھا اور بعدہٗ بمبئی منتقل ہوا میں قلمی ریکارڈز موجود ہیں۔ ہر رجسٹر انڈکس کے ساتھ ہے اور ان میں ان تمام خطوط کی نقلیں درج ہیں۔ جو آنریبل کمپنی کے ایجنٹ بڑے بڑے شہروں سے روانہ کرتے تھے۔ ان کے علاوہ مبلغین تثلیث کی وہ رپورٹیں بھی شائع ہو چکی ہیں جو وہ لسبن LISBON اور روم بھیجا کرتے تھے کم از کم جہاں تک جیسوسٹ مبلغین کا تعلق ہے، ان میں بھی کہیں کانپور کے کسی تھیئٹر کا ذکر نہیں ہے۔

یہ ایک علمی موضوع ہے۔ اس سے اردو تھیئٹر کی تاریخ وابستہ ہے۔ مناسب ہوگا کہ کوکب صاحب "چند الفاظ" میں ان تھیئٹروں کا ذکر فرمادیں جو "۱۸۳۰ء تک قائم ہو چکے تھے اور بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہے تھے"۔

عبدالعلیم نامی

------x x------

اردو کیلئے ہدایات

وزیر اعظم اندرا گاندھی نے بہار اور اتر پردیش کے وزرا اعلیٰ کو لکھا ہے کہ وہ تعلیمی اور انتظامی اداروں میں اردو کو اس کا جائز حق دلانے کی کوشش کریں۔ آپ نے ان وزراء کی توجہ آئین کی دفعہ ۲۹ اور ۳۰ کی طرف مبذول کرائی ہے جن میں اقلیتوں کو اپنی زبان اور کلچر کی حفاظت کے لیے اجازت دی گئی ہے۔ موصوفہ نے اصرار کے ساتھ کہا ہے کہ ان ریاستوں میں اردو کی تعلیم کے لیے سہولتیں مہیا کی جائیں اور تعلیمی اداروں کے قیام میں ان کی مدد کی جائے۔ آئین کی دفعہ ۲۹ میں کہا گیا ہے کہ "ہندوستان کی سرزمین یا اس کے کسی حصہ کے شہریوں کے کسی گروہ کو جس کی اپنی الگ زبان، رسم خط یا کلچر ہو اسے برقرار رکھنے کا حق ہوگا۔"

دفعہ ۳۰ میں کہا گیا ہے کہ "تمام اقلیتوں کو چاہے ان کی بنیاد مذہب پر ہو یا زبان پر یہ حق ہوگا کہ اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کریں اور ان کا انتظام کریں۔"

ان دفعات کا مفہوم بس اتنا ہے کہ اقلیت کو اپنے کلچر زبان اور رسم خط کو برقرار رکھنے کا حق ہوگا، دفعہ ۳۰ کا مطلب یہ ہے کہ اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی اجازت ہوگی ان دفعات میں یہ مذکور نہیں ہے کہ حکومت سرکاری اسکولوں میں اقلیتوں کی زبان میں تعلیم دینے کا بندوبست کرے گی یا وہ اقلیتوں کی پسند کے ادارے خود سرکاری طور پر قائم کرے گی زبان، کلچر اور رسم خط کی حفاظت کے لیے اقلیتوں کو آزادی دے دی گئی ہے لیکن اردو والوں کا مطالبہ تو یہ ہے کہ نہ صرف سرکاری تعلیمی اداروں میں اردو کی تعلیم کا پورا انتظام ہو بلکہ ہندی کے ساتھ اردو کی سرکاری حیثیت کو تسلیم کیا جائے اگر سرکاری حیثیت سے اردو کو تسلیم نہیں کیا گیا تو پھر کہنے سننے سے اردو کو سہولتیں دی جا سکتی ہیں جن کی کوئی قانونی حیثیت نہ ہوگی۔

اردو والوں کا اصل مطالبہ تو آئین کی دفعہ ۳۴۷ پر مبنی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "اگر اس بارے میں کوئی مطالبہ کیا جائے اور راشٹرپتی کو اس کا اطمینان بھی ہو جائے کہ کسی ریاست کی آبادی کے ایک قابل لحاظ حصہ کی خواہش ہے کہ وہ ریاست اس زبان کو جسے وہ حصہ بولتا ہے تسلیم کرے تو راشٹرپتی کو اس کا اختیار ہوگا کہ وہ ہدایت کریں کہ وہ زبان پوری ریاست میں یا اس کے کسی حصہ میں ان مقصدوں کے لیے استعمال کی جائے جن کی وہ صراحت کریں۔" وزیر اعظم اندرا گاندھی نے بہار اور اتر پردیش کو صرف ہدایت کی ہے کہ وہ اردو کو سہولتیں مہیا کریں، ایسی ہدایات تو ۱۹۵۸ء میں وزارت داخلہ کے ایک پریس نوٹ میں تفصیل کے ساتھ دی گئی ہیں۔ اگر واقعی اردو کو اس کا حق دلانا مقصود ہے تو وزیر اعظم کو آئین کی دفعہ ۳۴۷ کا حوالہ دے کر صدر جمہوریہ سے اعلان کرانا تھا۔ اسی مقصد کے لیے اتر پردیش اور بہار سے چالیس لاکھ سے اوپر دستخطوں کا ایک یادداشت صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا جس کا جواب بارہ سال کے بعد بھی نہیں دیا گیا، اگر اردو کو سہولتیں دی جا سکتی ہیں تو ان کو ردی کی ٹوکری میں بھی ڈالا جا سکتا ہے، کیونکہ انھیں کوئی قانونی حیثیت حاصل نہیں؛ لہٰذا اردو کو دفعہ ۳۴۷ کے تحت اس کا حق دلایا جائے، اگر اس کے بغیر بھی کام چل جاتا تو وزارت داخلہ کا پریس نوٹ ہی اس کے لیے کافی تھا۔ (الجمعیۃ)

اردو اور کانگریس سرکار

ہندوستان آزاد ہوئے بیس برس گزر گئے، اس عرصہ میں کانگریس کو ایک بار بھی اردو کا خیال نہ آیا۔ بلکہ ایسا اہتمام کیا گیا۔ گویا کہ اردو کوئی غیر ملکی اور جاہل زبان ہو اس کو تو دیش نکالا دینے کی کوشش کی گئی اور ایک غیر ملکی زبان انگریزی کو بڑھاوا دینے کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کی گئی۔ پنجاب کی حالت کو ہی دیکھ لیجیے! تقسیم ہند سے قبل کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اردو نہ جانتا ہو۔ اور اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ اردو جاننے والے گنے چنے لوگ ہی رہ گئے ہیں۔ اگر اردو کو ہندوستان میں زندہ رکھنا ہے تو (سرکار کی طرف دیکھنے کی بجائے) اردو والوں کو اس کے لیے خود کوشش کرنی ہوگی۔ جب وہ اتنے طاقتور ہو جائیں گے کہ کانگریس سرکار اردو کو نظر انداز نہ کر سکے گی۔ تو اسے خود بخود ہی سرکاری سرپرستی حاصل ہو جائے گی۔ اس کا سب سے بہترین طریقہ یہی ہے کہ عوام خاص طور پر بچوں اور نوجوانوں میں اردو پڑھنے کے لیے جذبہ پیدا کیا جائے، اور اردو کی پڑھائی کا انتظام کیا جائے۔ (مہا بھارت)

اردو اور اس کا استعمال

حیدرآباد کے انگریزی روزنامہ دکن کرانیکل نے اپنی امروزہ اشاعت میں اردو اور اس کا استعمال کے عنوان سے ایک اداریہ سپرد قلم کیا ہے اور ریاست کے تعلیمی اور انتظامی امید میں اردو کے استعمال اور اس کے حدود معین کرنے کا مشورہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ ایسا کرنے میں تاخیر سے نہ تو حکومت ہی کی کوئی ستائش اور نہ ہی اس سے عوام کا کوئی فائدہ ہو سکتا ہے۔ مدارس میں اس زبان کی تدریس کے لیے گنجائش رکھی گئی ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے دیکھا یہ گیا ہے کہ اکثر مدارس میں ان کی جائدادوں کے لیے مختص کردہ اسکیل کی وجہ سے ٹرینڈ عملے کے حصول کے لیے بڑی دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ معاصر موصوف نے ارباب تعلیمات کو وقتاً فوقتاً

اردو کے تعلق سے مختلف شکایات کا جائزہ لینے کے لیے مدارس کا معائنہ کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اردو نہ صرف حیدر آباد میں عام طور پر بولی جاتی ہے بلکہ اضلاع میں بھی اس کا رواج عام ہے۔

اداریہ آگے چل کر لکھا گیا ہے کہ جہاں تک ریاستی عوام کا تعلق ہے وہ تلگو کو آندھرا پردیش کی علاقائی زبان تسلیم کرتے ہیں اس میں نہ تو کوئی تعصب ہے اور نہ کوئی جبر و زور کار فرما ہے۔

لیکن حکومت سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس بات کو واضح کرے گی کہ آیا اردو کو بھی ان زبانوں میں شامل کیا گیا ہے جو سرکاری اغراض کے لیے استعمال کی جاتی ہیں اور یہ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے معتمد عمومی حبیب الرحمن صاحب کے ایک غلط بیان کی وجہ سے دبا گیا ہے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ بعض ریاستی وزرا اردو سے ہی ہمدردی رکھتے ہیں اور انھوں نے اس ضمن میں بیانات بھی دئیے ہیں لیکن جہاں تک عمل آوری کا تعلق ہے ضروری ہے کہ حکومت اس سلسلے میں اعلان شائع کرنے کے ساتھ ساتھ متعلقہ عہدہ داروں کے نام احکام بھی جاری کرے اداریہ میں اس بات کا اظہار کیا گیا ہے کہ ریاست میں اردو والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے ریاست کے کالجوں، مدارس دواخانوں اور تجارتی مراکز میں اس زبان کا چلن عام ہے۔

اداریہ کے آخر میں اردو کے متعلق ریاست کی دیگر زبانوں میں اس کی اہمیت کے پیش نظر حکومت کو مثبت فیصلہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

(ہندوستان بمبئی)

اردو کو یو پی اور بہار میں مناسب مقام عطا کیا جائے

وزیر اعظم اندرا گاندھی کا ریاستی حکومتوں کے نام مراسلہ

نئی دہلی۔ ماجد صالح کی اطلاع کے مطابق وزیر اعظم اندرا گاندھی نے کچھ ریاستی حکومتوں کو لکھا ہے کہ وہ اردو زبان کو دستور کی دفعات کے مطابق صحیح مقام عطا کریں اور اردو بولنے والے عوام کی جائز شکایات کا بلا تاخیر ازالہ کریں اس وقت ہندوستان کے مختلف مقامات سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ صدر جمہوریہ کو دفعہ ۳۴۷ کے تحت اردو کے لیے احکام نافذ کر دینا چاہیے۔

مسز گاندھی نے وزرائے اعلیٰ کے نام اپنے مراسلے میں لکھا ہے کہ ہر ریاست میں ایک ایسا دفتر اور نظام بنایا جائے جو اردو بولنے والی نیز دوسری لسانی اقلیتوں کی شکایات کو سن کر انھیں دور کرے۔

دفعہ ۳۴۷ کی رو سے صدر جمہوریہ کو حق حاصل ہے کہ اگر وہ اس بات سے مطمئن ہوں کہ ریاست کی آبادی کا کوئی معتدبہ حصہ کسی خاص زبان کے استعمال کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو وہ ریاستی حکومتوں کو حکم دے کر پوری ریاست یا اس کے کسی علاقے میں اس زبان کے تسلیم کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔

وزیر اعظم نے اپنے مراسلے میں لسانی اقلیتوں کے کمیشن کی رپورٹ سے کچھ اعداد و شمار پیش کیے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ وزرائے اعلیٰ جن باتوں پر متفق ہو چکے ہیں ان پر عملدر آمد کرنے میں افسوسناک حد تک سستی برتی گئی ہے اس لیے ضروری ہے کہ اب بہت تیزی کے ساتھ عمل کیا جائے۔

مراسلہ میں دفعہ ۳۴۵ کا بھی حوالہ دیا گیا ہے جس کی رو سے ریاست کی کسی سرکاری زبان کے سلسلے میں ریاستیں کوئی قانون بنا سکتی ہیں۔

مسز گاندھی کے خیال میں اردو کے سلسلے میں یو۔پی اور بہار میں اور دوسری ریاستوں میں جو شکایتیں پائی جاتی ہیں ان ریاستوں کو ان کے ازالے کے کافی اختیارات حاصل ہیں اور اس طرح صدر کی مداخلت کے بغیر یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انتخابات کے بعد مرکز کی نئی حکومت جن چند مسائل پر پوری توجہ کرے گی اردو بھی ان میں سے ایک ہے۔

(دعوت دہلی)

اردو کو بہار میں علاقائی زبان کا درجہ دے دیا جائے

ہزاری باغ۔ وزیر اعلیٰ بہار مسٹر کرشن بلبھ سہائے نے یہاں کے مسلمان دوٹروں سے کہا کہ ان کے دل میں ان کے لیے بڑی ہمدردی ہے۔ اور مسلمانوں کے پچھڑے ہوئے طبقہ کی ترقی اور بھلائی کے لیے سخت کوشاں ہیں۔ تین سو مسلمانوں کے اجتماع میں وزیر اعلیٰ سہائے نے کہا کہ حکومت بہار نے مرکزی حکومت سے سفارش کی ہے کہ اردو کو بہار میں علاقائی زبان کا درجہ دے دیا جائے۔

(چند اردو پٹنہ)

شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کی ادبی نشست

شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام پروفیسر اسلوب احمد انصاری صدر شعبہ انگریزی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ادبی تاریخ اور ادبی تنقید کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ پڑھا جلسہ کی صدارت ڈاکٹر محمد حسن نے کی۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اپنے مقالہ میں ادبی تاریخ اور ادبی تنقید کے رشتہ پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ ادبی تاریخ کا کام محض واقعات کی کھتونی یا ادیبوں کی فہرست مرتب کرنا نہیں ہے بلکہ ہر دور کے بدلتے ہوئے تصورات کے آئینہ میں اقدار

کا تعین کرنا بھی ہے ادبی مورخ ادب کو وقت اور تاریخ کے وسیع پس منظر میں دیکھتا ہے اور اس کا تجزیہ زیادہ حکیمانہ اور معروضی ہوتا ہے اس کے مقابلے میں ادبی تنقید زیادہ داخلی اور تاثراتی ہوتی ہے اور ادب کا نقاد ہر کارنامہ میں زیادہ گہری ابدیت کی تلاش کرتا ہے انھوں نے فرمایا کہ اردو میں تاریخ تصورات مرتب کرنے کا کام ابھی شروع ہوا ہے اور یہ ضروری ہے کہ ادبی تاریخ اور ادبی تنقید کے رشتوں کو اچھی طرح سمجھا جائے تاکہ ہماری تنقید میں زیادہ توانائی اور ہماری ادبی تاریخ میں زیادہ بصیرت پیدا ہو سکے۔

مقالے کے بعد ڈاکٹر قمر رئیس شہاب جعفری شمشیر بہادر سنگھ اور جناب صدیق الرحمٰن صاحبان نے بحث کیا آخر میں شعبہ کی جانب سے شکریہ ادا کیا گیا۔

(سید ظہیر الحسن۔ سکریٹری شعبہ
اردو۔ دلی یونیورسٹی دلی ۸)

اردو اکیڈمی کا سرمایہ ختم ہوگیا
عملہ کو برطرفی کا نوٹس

لاہور معلوم ہوا ہے کہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی نے مالی وسائل کی کمی کی بنا پر اپنے سارے عملے کو یکم فروری ۱۹۶۷ء سے دو ماہ کے نوٹس پر ملازمت سے علیحدگی کی اطلاع دے دی ہے اکیڈمی کے جملہ علمی اور تصنیفی منصوبے معطل کر دئے گئے ہیں۔

اس وقت اکیڈمی کے تصنیفی پروگراموں میں طبیعیات کیمیا، انجینیرنگ، فلسفہ، فنون اور ادب کے انسائیکلوپیڈیا اور لغت کے علاوہ تقریباً بیس علمی اور سائنسی کتابیں زیر تدوین و زیر طبع ہیں ان سب منصوبوں کو فوری طور پر معطل کر دیا گیا ہے۔

ہوشیارپور پنجاب میں یوم اردو کی تقریب

انجمن ترقی اردو پنجاب کی ہوشیارپور شاخ کے زیر اہتمام 'یوم اردو' کی تقریب مورخہ ر جنوری ۱۹۶۷ء کو منائی گئی۔

تقریب کا آغاز پریم کمار نظر کی تقریر سے ہوا۔

پریم کمار نظر نے انجمن ترقی اردو پنجاب کے پچھلے دو اجلاس میں پاس کی گئی قراردادوں کا ذکر تفصیل سے کیا اور حکومت سے اپیل کی کہ اردو کی قومی اور ادبی خدمات کے پیش نظر اس پیاری زبان کی حفاظت کی جائے۔

مقامی گورنمنٹ کالج کے عظیم الشان ہال میں ایک محفل مشاعرہ منعقد ہوئی جس کی صدارت گورنمنٹ کالج کے پرنسپل نے فرمائی۔

مشاعرہ کی تمام تر کارروائی آل انڈیا ریڈیو جالندھر نے ریکارڈ کی اور اپنے اردو پروگرام "آتش و گل" میں قسط وار نشر کی۔

مشاعرہ میں حضرات میلا رام وفا، قیس جالندھری، ساحر سیالکوٹی، پرنسپل ست پرکاش سالک، عرش صہبائی، کرشن ادیب، عبدالحق برق، اوم پرکاش عاقف، رمیش کوسلہ اسید، کنول میرٹھی، ن۔ ن۔ انجم، مہر گیرا، مختار حسین شوق، اختر ہیرے داسیہ، ابناش چندر سود اور سری رام عرش نے شرکت فرمائی اور اپنے بہترین کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔

اپنے خطبۂ صدارت میں پرنسپل چاولہ نے فرمایا کہ اردو شاعری میں جو تاثر اور جادو پایا جاتا ہے وہ شاید ہی دنیا کی کسی اور زبان میں موجود ہو۔

آپ نے مزید فرمایا کہ اردو سرکاری سرپرستی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی خوبیوں کی بنا پر زندہ رہے گی۔

آپ نے تمام اردو دوستوں سے اپیل کی کہ وہ اردو کی شمع کو روشن رکھنے کی ہر ممکن سعی کریں۔

پریم کمار نظر نے تمام شعراء حضرات پرنسپل چاولہ اور آل انڈیا ریڈیو جالندھر کے اراکین کا شکریہ ادا کیا اور محفل برخاست کی۔

(ڈسٹرکٹ آرگنائزر انجمن ترقی اردو پنجاب ہوشیارپور)

بریلی کے کالج میں اردو کی تعلیم

آپ کے اخبار کے ذریعہ میں جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند، لسانی کمشنر اترپردیش ڈائرکٹر آف ایجوکیشن اور چیرمین میونسپل بورڈ بریلی کی توجہ مندرجہ ذیل حقائق کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

کستوربا میونسپل گرلس انٹر کالج بریلی میں امسال درجہ ششم میں چار، درجہ ہفتم میں گیارہ درجہ ہشتم میں تیرہ طالبات نے اردو تیسری زبان کی حیثیت سے لی تھی اور موجودہ پرنسپل صاحبہ کی منتقلی کے زمانے میں اردو کی تعلیم دی جارہی تھی مگر اب چھٹے درجے کی طالبات کو اردو کے بجائے سنسکرت دلوادی گئی ہے۔ اور کوشش کی جارہی ہے کہ درجہ ہفتم اور ہشتم کی طالبات بھی اردو چھوڑ دیں۔ لہٰذا حکام بالا سے درخواست ہے کہ وہ کالج کے ذمہ داروں کو اردو دشمنی سے باز رہنے کی ہدایت کریں نیز یہ بھی حکم دیا جائے کہ آئندہ سال سے نہم میں اردو کی سہولت ان طالبات کو ضرور دی جائے جو اردو لینا چاہیں۔ یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ کالج میں ایسی ٹیچر موجود ہیں جو اردو پڑھا سکتی ہیں اور پڑھاتی ہیں۔

(عبدالوحید خاں بریلی)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر ظہیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا